انٹرویو: عرفان احمد / عبدالرؤف

میری علمی ومطالعاتی زندگی

[پروفیسر عبدالقدیر سلیم سے انٹرویو]

اللہ کے فضل وکرم سے میری پیدائش ایک دین دار، علمی گھرانے میں ہوئی۔ والد محمد سلیم عبداللہؒ روایتی دین دار یا مولوی نہیں تھے۔ ان کا تعلق غازی پور سے تھا اور وہ میرے دادا مرحوم کے ساتھ وہاں سے ہجرت کر کے غیر منقسم ہندوستان کے صوبے سی پی (Central province) کے شہر امراؤتی میں بس گئے تھے۔ یہاں اکثریت ہندوؤں کی تھی، مسلمانوں کی آبادی ۴ فی صد کے لگ بھگ تھی۔ ہندوستان کی زبان مراٹھی تھی، لیکن مسلمان جنوبی ہند/حیدرآباد دکن جیسی اُردو بولتے تھے۔ تاہم ہمارے گھرانے پر یوپی کی اُردو ہی کے اثرات رہے اور ہماری مقامی اُردو سے کچھ مختلف رہی۔ میرے ننھیال کے بزرگ قاضی تھے اور دہلی سے یہاں آ کر بس گئے تھے۔

میرے والد رحمۃ اللہ علیہ نے ابتدائی تعلیم امراؤتی ہی میں حاصل کی، پھر انہوں نے مولوی محمد شفیع مرحوم (اورینٹل کالج لاہور) سے خط وکتابت کی اور اُنہیں اس کالج میں داخلہ مل گیا۔ مولوی محمد شفیع صاحب نے کہا کہ سی پی سے آ کر یہاں داخلہ لینے والے آپ پہلے طالب علم ہیں۔ وہاں اُنہیں ہاسٹل میں بھی داخلہ دیا دیا گیا۔ وہاں سے والد صاحب نے فارسی میں فاضل کی سند لی۔ امراؤتی میں انہیں نارمل سکول (ٹیچرز ٹریننگ سکول) میں مُعلم ادبیات کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ انہوں نے اُردو کی درسی کتابیں (''نئی کتاب'') لکھیں جو نول کشور پریس لکھنو سے شائع ہوئیں۔ ان کے علاوہ ''اُردو کیسے پڑھائیں؟'' اور مختلف موضوعات پر منتخب قرآنی آیات کا مجموعہ البینات شائع کیا۔ وہ اپنے ادارے کے تعلیمی مُجلے ''بہارستان'' کے مدیر بھی تھے۔ یہاں انہوں نے ''ادارہ قرآنیہ'' بھی قائم کیا تھا جو قرآنی احکام وآیات سے متعلق ذکریٰ کے عنوان سے چھوٹے چھوٹے رسائل بھی شائع کرتا تھا۔ اس ادارے کا ایک کتب خانہ بھی تھا۔

مطالعہ کا شوق مجھے والدین سے ورثہ میں ملا تھا۔ والد صاحب جن جرائد کو دیکھتے تھے، اُن میں جامعہ (دہلی)، معارف (اعظم گڑھ)، ترجمان القرآن (حیدرآباد دکن/لاہور)، ہمایوں (لاہور)، اورینٹل کالج میگزین (لاہور)، نگار (لکھنو) اور صدق/صدق جدید شامل تھے۔ والدہ صاحبہ اور بڑی بہن کے لیے ''عصمت''، ''تہذیب نسواں'' آتے تھے۔ راشد الخیری، مولوی ڈپٹی نذیر احمد اور خواجہ حسن نظامی کی تحریروں سے میرا تعارف لڑکپن ہی میں ہو گیا تھا۔ اپنی خالہ جان سے ''عذرا'' (She) اور ''عذرا کی واپسی'' کی داستانیں کئی دن قسطوں میں سنیں۔ نہ صرف گھر کا ماحول

مطالعے میں ممد ومعاون تھا، بلکہ جن مدارس میں، میں نے تعلیم پائی، وہاں بھی اچھے کتب خانے دیکھے۔ نارمل سکول کی لائبریری سے منسلک میرے والد مرحوم کا کمرہ تھا۔ وہاں کتابیں دیکھنے کھولنے اور اُلٹ پلٹ کرنے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ گھر میں بھی والد مرحوم کی اچھی خاصی نجی لائبریری تھی۔ تقسیم کے بعد ہم اس ذخیرے کا ایک مختصر سا حصہ ہی ساتھ لا سکے۔ باقی کتابیں جہاں رکھوائی گئی تھیں کہ حالات بہتر ہوں گے تو منگوالیں گے۔ فسادیوں کی لُوٹ مار میں ضائع ہوگئیں۔

مطالعہ کا شوق چوں کہ بچپن سے تھا، اس لیے کسی خاص موضوع کو ہدف بنا کر نہیں پڑھا۔ جو کتاب سامنے آئی، اُلٹ پلٹ کر دیکھی اور جہاں تک دلچسپی ہوئی، مزہ آیا، پڑھنے لگے ورنہ رکھ دی۔ ''تذکرہ غوثیہ'' سے لے کر ''الف لیلہ'' تک لڑکپن ہی میں پڑھ ڈالیں (والدہ صاحبہ نے میرے ہاتھ میں ''الف لیلہ ولیلہ'' دیکھی تو کہا، کہاں سے یہ واہیات کتاب لے آئے ہو؟ ابا مرحوم نے کہا، پڑھنے دو۔

مطالعہ کے ضمن میں میرا کوئی مخصوص موضوع نہ تھا۔ تاریخ وسوانح سے لے کر دینیات، سیاسیات، ادب (تنقید) شاعری، ناول، افسانے، غرض ہر طرح کا رطب ویابس پڑھنے کی کوشش کی کچھ سمجھ میں آتا تھا اور کچھ نہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ پہلے ایم۔اے کے لیے میں نے ایک بہت ہی معمولی مضمون کے لیے ''تخصیص'' کی، فلسفہ جو مابعد الطبعیات کے علاوہ اور کون سے علوم ہیں، جنہیں پھلانگنے کی کوشش نہیں کرتا؟

(Philosopher are the spectators of all time and all existence)

ایک طویل علالت کی وجہ ''اُردو ہائی سکول'' امراؤتی میں آٹھویں جماعت ہی سے میرا رسمی تعلیمی سلسلہ منقطع ہوگیا تھا، لیکن پڑھائی کا سلسلہ نہ رُکا۔ قرآن مجید تو گھر پر مولوی صاحب آ کر پڑھا جاتے تھے، والد صاحب نے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھایا۔ اُن کا خیال تھا کہ اُردو جاننے والوں کے لیے قرآنی عربی کو سمجھ لینا زیادہ مشکل نہیں۔ عربی زبان کے بہت سے الفاظ جو قرآن مجید میں ہیں، اُسی مفہوم یا ملتے جلتے مفہوم میں اُردو میں بھی مستعمل ہیں (حمد، اللہ، رب، عالم/عالمین ایسے سینکڑوں الفاظ)۔ تھوڑے ہی الفاظ ایسے ہیں جن سے اُردو داں قطعاً نا آشنا ہوں گے۔ عربی کے تھوڑے سے قواعد زبان سے آشنا کر کے کسی طالب قرآن کو آسانی سے مضامین ومفاہیم قرآن تک لے جایا جا سکتا ہے۔ اس طرح انہوں نے نہ صرف مجھے بلکہ بہت سے شائقین کو قرآن کریم کی تعلیم دی اور اسی اُصول پر ''مصباح القرآن'' مرتب کی جو زیر طبع ہے۔ یہ نہ صرف ایک منفرد قرآنی لُغت ہے، بلکہ قرآنی/عربی گرامر کی ایک ایسی کتاب ہے جس سے استفادہ کر کے اُردو دان قرآن کے مطالب تک خود آسانی سے پہنچ سکتے ہیں، یعنی قرآن کا خود ترجمہ سمجھ اور کر سکتے ہیں۔

تقسیم ملک کے کچھ عرصے بعد ہمیں ''آزاد'' ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آنا پڑا۔ والد صاحب نے وقت سے پہلے ہی پنشن لے لی تھی۔ یہاں ہم اپنے عزیزوں کے ساتھ ایک فلیٹ میں منتقل ہوگئے۔ والد صاحب نے کراچی کے ''دہلی پنجاب نیشنل ہائی سکول'' میں میٹرک میں داخل کرا دیا۔ یہ ایک نجی تعلیمی ادارہ تھا۔ مالکان جو پڑھے لکھے اور ہمدرد استاد بھی تھے، دہلی سے تعلق رکھتے تھے اور پنجاب میں میٹرک کے طلبہ کو تیار کرتے تھے۔ طلبہ پر اساتذہ کی شفقت ومحنت مثالی تھی۔ سکول میں طلبہ کی نشست فرشی تھی۔ دریاں صاف ستھری ہوتی تھیں۔ اُوپر ٹین کی چھت تھی۔ سکول میرے گھر سے کوئی ۵ میل دُور ہوگا۔ پیدل جاتے تھے اور راستے میں جیومیٹری کی تھیوریز دُہراتے اور دوسرے سبق یاد کرتے

جاتے تھے۔ آج دیکھتا ہوں کہ بچے ایک آدھ کلومیٹر کے لیے بھی بس کے بغیر سفر نہیں کرتے۔

جتنی محنت اور یکسوئی سے پڑھائی کی، شاید پھر نصیب نہ ہوئی۔ لاہور جا کر امتحان دیا۔ سکول مالکان ساتھ گئے، انہوں نے طلبہ کے ٹھہرنے کے لیے ایک سکول میں انتظام کیا تھا۔ رات کو وہ ''کوچنگ'' کرتے اور صبح کو ہم طلبہ امتحان دینے جاتے۔ میٹرک میں میری فرسٹ ڈویژن آئی۔ اس میں بڑا دخل مشفق اساتذہ اور سکول کے منتظمین کا تھا۔ آج چاروں طرف نظر ڈالتا ہوں تو ایسے نجی تعلیمی ادارے نظر نہیں آتے۔ سرکاری سکول بدنام ہو گئے ہیں کہ ان میں پڑھائی نہیں ہوتی، اساتذہ دلچسپی نہیں لیتے۔ اُنہیں اپنی کوچنگ/ٹیوشن میں زیادہ دلچسپی ہے یا اپنا کوئی دوسرا کاروبار ہے جو ان کے اوقات اور محنت کا بہتر مصرف ہے۔ ہر طرف پرائیویٹ سکولوں اور کوچنگ سینٹروں کی بھرمار ہے۔ اچھے اور معیاری سکول غریب تو کیا متوسط طبقے کی پہنچ سے بھی دور ہیں۔

میٹرک کے بعد سندھ مسلم کالج کراچی میں داخلہ لیا۔ معاشیات، شہریت اور عربی میرے مضمون تھے۔ یہاں بھی اساتذہ اچھے اور محنتی تھے۔ میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے امتحان بھی جامعہ کراچی لیا کرتی تھی، ابھی ان کے لیے بورڈ وجود میں نہیں آئے تھے۔ انٹر میں بھی میں نے فرسٹ ڈویژن میں کیا اور پہلی پوزیشن لی۔ اس زمانے کا ایک واقعہ میرے دل پر نقش ہے۔ ہماری مالی حالت بہت اچھی نہ تھی۔ سال کی ۱۴۴/روپے فیس بھی ایک بڑی رقم محسوس ہوتی تھی۔ کالج میں داخلے کے کچھ دن بعد نوٹس بورڈ پر اطلاع دیکھی کہ فیس کی معافی یا نصف فیس کے لیے درخواست کے فارم دفتر سے لیے جا سکتے ہیں۔ میں نے ایسا فارم لیا، اسے پر کیا۔ ایک جگہ والد کے دستخط ہونے تھے۔ ابا مرحوم کے پاس لے گیا۔ پوچھا، کاہے کا فارم ہے؟ میں نے کہا، فیس کی معافی کے لیے درخواست ہے۔ فرمایا، ہم نے تمہیں کالج میں داخل کرایا تو اخراجات کا اندازہ کر لیا تھا۔ ہم فیس معاف نہیں کروائیں گے۔ یہ رقم کسی حقیقی مستحق کے کام آئے گی۔

بی۔اے میں میرے اختیاری مضامین معاشیات اور فلسفہ تھے۔ فلسفہ میں ایک پرچہ ''نفسیات'' کا بھی ہوتا تھا جسے پروفیسر فضل الرحمٰن پڑھاتے تھے۔ وہ عرصے تک انگلستان میں رہے تھے اور سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں سے یورپین معلوم ہوتے تھے۔ سائیکل پر کالج آتے۔ اس زمانے میں اساتذہ بسوں اور سائیکلوں ہی پر کالج آتے تھے۔ دوسرا پرچہ ''اخلاقیات'' پروفیسر جمیلہ خاتون پڑھاتی تھیں۔ بعد میں انہوں نے اقبال پر تحقیقی مقالہ لکھا اور پی۔ایچ۔ڈی کی سند لی۔ اسلامیات جو لازمی مضمون تھا، مولانا یحییٰ ندوی جیسے قابل استاد پڑھاتے تھے۔ یہیں میری ملاقات اور دوستی ظفر اسحٰق انصاری، منظور احمد، خورشید احمد، خرم جاہ مراد، محمد مسلم سجاد، سید محمد یاسین اور بہت سے دوستوں سے ہوئی۔ ظفر اسحٰق کے والد صاحب، مولانا ظفر احمد انصاری کے ہاں اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ وہیں ماہر القادری مرحوم اور بہت سے دوسرے لوگوں سے تعارف ہوا۔ سندھ مسلم کالج ہمارے گھر سے کوئی ڈھائی میل دور تھا۔ پیدل ہی آنا جانا رہتا تھا۔

جامعہ کراچی میں ایم۔اے شعبہ فلسفہ میں داخلہ لیا۔ ڈاکٹر محمد محمود احمد (ایم۔ایم۔احمد) صدر شعبہ تھے۔ اساتذہ میں طیب حسین انصاری اور انیس احمد صاحب کے علاوہ مولانا فضل الرحمٰن (اسلامک مشن) اور فادر ریمنڈ (سینٹ پیٹرکس، نفسیات) سے پڑھنے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ جامعہ کراچی کی اپنی کوئی عمارت نہیں تھی۔ پرنس اسٹریٹ (ڈاؤ میڈیکل کالج/سول ہسپتال) کے قریب رنچھوڑ لین کی کچھ متروکہ عمارتوں میں جامعہ کے مختلف شعبے اور دفاتر تھے۔

وائس چانسلر اے۔بی۔اے۔حلیم (ابا حلیم) بھی یہیں بیٹھتے تھے۔اساتذہ اور انتظامیہ کے افراد میں بڑی سادگی تھی۔ ہمارے صدر شعبہ تانگے/ گھوڑا گاڑی میں کینٹ اسٹیشن کے قریب اپنی رہائش گاہ سے جامعہ آتے اور اسی طرح واپسی ہوتی۔اکثر شیروانی اور ترکی/رومی ٹوپی میں ہوتے۔کبھی کبھی سوٹ یا آکسفورڈ کا بلیزر بھی پہن کر آتے۔وہ وائس چانسلر پروفیسر اے بی حلیم کے بھانجے تھے اور دونوں ایک ہی متروکہ (دومنزلہ) عمارت میں رہائش پذیر تھے۔لیکچرر بننے کے بعد بھی اکثر ڈاکٹر صاحب کے گھر جانا ہوتا تھا۔گاندھی گارڈن کے قریب جہاں ہمارا فلیٹ تھا، وہاں سے پیدل ہی آمد و رفت ہوتی تھی۔ناظم آباد منتقل ہو گئے تو صدر تک بس میں اور وہاں سے پیدل اپنے استاد کے گھر جاتے تھے۔

ایم۔اے کرنے کے فوراً بعد ہی مجھے عثمانیہ کالج میں فلسفہ پڑھانے کے لیے ملازمت مل گئی۔ایک دن والدہ صاحبہ نے اخبار میں اشتہار دیکھا تو کہا، سرکاری کالج میں لیکچرر شپ کے لیے درخواست کیوں نہیں دے دیتے؟ میں سندھ کی نظامت تعلیم (سعید منزل، بندر روڈ) گیا۔ڈائریکٹر نظامانی صاحب سے ملا، اللہ انہیں جنت نصیب کریں۔بڑی محبت سے ملے اور جلد ہی مجھے تقرری کا خط مل گیا۔اس زمانے میں ''رسمیات'' نہ ہونے کے برابر تھیں۔اس طرح گورنمنٹ کالج نواب شاہ میں میری پہلی (سرکاری) تقرری ہوئی۔اس کے بعد سندھ کے کئی کالجوں میں تدریس کے لیے جانا ہوا۔میرا مشاہدہ تھا کہ سندھ کے سرکاری کالجوں کے کتب خانے بڑے معیاری ہوتے تھے۔نہ صرف کتابیں بلکہ ملکی اور غیر ملکی جرائد کی خریداری عام بات تھی۔کتب خانوں کے لیے بڑی رقوم رکھی جاتی تھیں اور انگریزی اور اُردو کتابوں کی خریداری کوئی مسئلہ نہیں تھی۔بدقسمتی سے یہ بات اب ماضی کی داستان ہے۔

اللہ کا فضل و کرم ہی ہے کہ میرا بچپن لڑکپن اور موجودہ عمر کو کتابوں کا ماحول میں میسر ہوا۔لڑکپن میں عرب شاعر متنبّی کا ایک شعر پڑھا تھا کہ دنیا میں نشست کے لیے برق رفتار گھوڑے کی پیٹھ سے بہتر کوئی جگہ نہیں اور زمانے میں بہترین دوست کتاب ہے۔مختلف ادوار میں میری پسندیدہ کتابوں میں الف لیلہ، قصر صحرا (عظیم بیگ)، صنوبر کے سائے، میری ناتمام محبت (حجاب امتیاز علی)، فسانہ آزاد (رتن ناتھ سرشار)، واردات، دودھ کی قیمت (منشی پریم چند)، میرے بھی صنم خانے، آگ کا دریا (قرۃ العین حیدر)، Portait of a lady (ہنری جیمز)، آرتھر کائن ڈائل (شرلاک ہومز والے) کی ساری کتابیں، جیمز مچنر کی اور ابن صفی کی ساری کتابیں، ایم اسلم اور سیم حجازی کے ناول، پطرس بخاری، قدرت اللہ شہاب، مختار مسعود، ممتاز مفتی، اشفاق احمد کی کہانیاں نوجوانی میں پڑھیں۔انگریزی میں رسائل میں Reader's Digest اور پھر بعد میں New week میرے پسندیدہ رسائل تھے۔بعد میں Economist سے تعارف ہوا اور میرا خیال ہے کہ ہفت روزوں میں یہ بہت اچھا رسالہ ہے۔

میرا زیادہ تر مطالعہ اُردو اور انگریزی زبانوں میں ہے۔ابتدا میں کچھ کلاسیکی عربی ادب سے شناسائی ضرور تھی۔اس کے علاوہ فارسی کی بھی کچھ ابتدائی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔میرا خیال ہے کہ اچھی اُردو کے لیے عربی اور فارسی سے آشنائی بھی ضروری ہے۔بدقسمتی سے آج تعلیم کی شاہراہ (mainstream) ہیں۔میں ان دونوں زبانوں سے بے اعتنائی برتی جا رہی ہے، لیکن وہ معیاری/علمی اُردو سے نابلد ہو گئے ہیں، اور نہ صرف یہ کہ وہ پچھلی (بیسویں) صدی کے اُردو علمی ورثے سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔بلکہ سنجیدہ علمی افکار کو اپنی ''قومی'' سرکاری زبان میں اظہار کے قابل بھی نہیں رہے۔

سنجیدہ ادب میں جن مصنفین اور تحریروں نے مجھے متاثر کیا، ان میں شیخ احمد سرہندی (مکتوبات اور دوسرے رسائل) شاہ ولی اللہ کی بعض تحریریں، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا جعفر پھلواری، مولوی محمد علی لاہوری (خصوصاً سیرۃ پر اُن کی تصنیف)۔ اُن کی تفسیر کے بعض افکار سے مجھے اختلاف ہے جہاں وہ سید اور جدیدیت سے متاثر محسوس ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ (خصوصاً عہد نبوی میں نظام حکمرانی اور خطبات بہاولپور)، شبلی اور سید سلیمان ندوی کی سیرت النبی۔ تفاسیر میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا ایک منفرد مقام ہے۔ ان کی تفہیم القرآن بلاشبہ تفسیری ادب میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ تاہم ایک طویل دورانیے میں تکمیل پذیر ہونے کی وجہ سے بعض مقامات پر وہ اپنی ابتدائی انقلابی فکر سے ہٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مطالعہ فلسفہ کے ابتدائی دور میں، میں اقبال کے خطبات سے بھی متاثر تھا، لیکن بعد میں زیادہ مطالعہ سے اُن کی ''نثری فکر'' کی کمزوریاں بھی نظر آئیں، خصوصاً اُن کے بعض اجتہادات جن کو آج اقبال کی اصل اسلامی فکر اور اُن کی ''روشن خیالی'' کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جب کہ ''جدید ترکی'' کی جمہوریت سے اُن کی اثر پذیری کو بعض لوگ مرعوبیت کا نام بھی دے سکتے ہیں، جب کہ یہ اُن کی حقیقی فکر نہ تھی۔ اپنے شعر میں تو علامہ نصیحت فرماتے ہیں:

گریز از طرز جمہوری غلامے پختہ کارے شو کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

اس طرح اور بھی کئی باتیں ہیں۔ اور مسائل پر اُن کے اجتہاد نیم پختہ ہی محسوس ہوتے ہیں، تاہم شعر میں اُن کی فکر اکثر ''الہامی'' محسوس ہوتی ہے اور خیال ہوتا ہے کہ ''آفاقی دانش'' جو ایک ماورائی تصور ہے، اپنے اظہار کے لیے کسی کو اپنا ذریعہ (medium) بنا لیتی ہے، چاہے وہ شخص اپنی عمومی ذہانت اور زندگی میں اُس معیار، افتاد اور کردار کا نہ ہو جیسا کہ وہ اپنے کلام میں نظر آتا ہے۔ بقول غالب:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں غالب! صریر خامہ نوائے سروش ہے

لڑکپن میں دیوان حماسہ، متنبّی اور مقامات بدیع الزمان ہمدانی اور اسی طرح کے عربی ادب کے کچھ حصے پڑھے تھے۔ فارسی میں گلستاں بوستاں اور کچھ غالب کا کلام (فارسی) پڑھا۔ وہ کتابیں جو عموماً میرے بستر ہوتی ہیں، کلیات اقبال اور دیوان غالب ہیں۔ ہندوستان میں جہاں ہمارے لیے کتابیں آسانی سے دست یاب نہ تھیں، والد صاحب نے اقبال کی ''اسرار خودی'' کی اچھے کاغذ کی ایک مجلد کاپی مجھے دی اور فرمایا کہ اس کتاب کو نقل کر لو (فوٹو کاپی اس زمانے میں نہیں ہوتی تھی)۔ کچھ صفحات ابا نے لکھے اور بیشتر میں نے، اس طرح اقبال کے فارسی کلام کی کچھ شد بد لڑکپن ہی میں ہو گئی تھی۔ ''اسرار خودی'' کا والد صاحب نے اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ اور ''رموزِ خودی'' دونوں مجھے بے حد پسند ہیں۔ اقبال کی نظموں میں ''شکوہ'' اور جواب شکوہ''، ''مسجد قرطبہ'' اور ''سوز و ساز''، ''طلوع اسلام'' پسند ہیں۔ میرے خیال میں فکر و فن کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو محمد اقبال دنیا کے سب سے بڑے شاعر ہیں، کم از کم اُردو اور انگریزی شاعری میں جس کا کچھ میں نے مطالعہ کیا ہے۔ غالب، ذوق، داغ اور میر کی کچھ غزلیں (کلیات میر کو دیکھ کر مایوسی ہوئی) اور نئے شعرا میں فیض احمد فیض (جوش کے ہاں الفاظ کا شکوہ اور جادو زیادہ ہے)۔ انگریزی شاعری عموماً پھیکی اور طفلانہ محسوس ہوتی ہے۔ شیکسپیئر کے کئی ڈرامے پڑھے، لیکن اس کا جولیس سیریز مجھے اچھا لگا۔

حالی کی مسدس مدوجزر اسلام، اس کا کافی حصہ بچپن میں زبانی یاد تھا۔ خصوصاً یہ نعتیہ اشعار

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

میرے خیال میں اُردو کی بہترین نعتیہ شاعری میں شمار کیے جانے کے لائق ہیں۔

اپنے فکری تضادات کا مجھے اعتراف ہے۔ ایک طرف تو روایتی علما میں مولانا اشرف علی تھانوی، (ان کی ''بہشتی زیور'' ہمارے ہاں جہیز میں ضرور دی جاتی تھی اور میرا خیال تھا کہ اس طرح کی کوئی کتاب یا اس کا کوئی نظر ثانی شدہ/ترمیم شدہ ایڈیشن اب بھی اس مقصد کے لیے کارآمد ہوگا) پسند تھے اور دوسری طرف سرسید، ابوالکلام آزاد، مولانا مودودی، شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، گاندھی جی (تلاش حق)، علی شریعتی (On the Sociology of Islam, Hagerism) کارل مارکس، میکس ویبر جیسے مفکر اور مصنف۔

مفکرین میں مجھے سقراط/افلاطون اور کانٹ نے متاثر کیا۔ سقراط کی زندگی اور تعلیمات (اگر اس میں سے افلاطون کے حشو وزوائد نکال دیے جائیں) پیغمبروں کی سی نظر آتی ہے۔ کانٹ کے فلسفہ اخلاق کی اسلامی تعلیمات سے کافی مماثلت ہے۔ ان کے علاوہ جارج برکلے کی تصوریت پڑھنے میں مزا آتا تھا، اگرچہ میں نے اس کی ''نتائجیت'' کے فلسفے سے کبھی کلی طور پر اتفاق نہیں کیا۔ کارل مارکس اور اینجلز کے فلسفے کی تمام تر جزئیات سے مجھے اتفاق نہیں، لیکن میں انہیں عظیم (اور مخلص) فلاسفروں میں شمار کرتا ہوں۔ میں نے مارکس کی Capital کی پہلی جلد اور کئی دوسری تحریریں پڑھیں اور اُن سے متاثر ہوا۔ عصری مفکرین میں سی۔ ڈبلیو۔ ملز کی تحریروں میں گہرائی اور سچائی محسوس کی۔ کمرہ جماعت میں ایک دفعہ رُشدی کی The Satanic Verses کا ذکر آیا۔ میں نے نہیں پڑھی تھی۔ ایک طالبہ نے مجھے پڑھنے کو دی۔ غصہ تو کیا آتا، سچ تو یہ ہے کہ یہ کتاب مجھ سے پوری پڑھی ہی نہیں گئی۔ نہایت غیر دلچسپ اور غیر معقول لگی۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کی ایک طرح کی شہرت اور ''پذیرائی'' کیوں ہوئی۔

جو کتابیں اور تحریریں مجھے اچھی لگتی ہیں، میں چاہتا ہوں کہ دوسرے بھی انہیں پڑھیں۔ اس کے لیے میں اکثر وہ کتابیں، تحریریں اپنے عزیزوں اور حلقہ احباب میں دیتا ہوں یا انہیں متعارف کراتا ہوں۔ اگر تحریر چھوٹی ہو تو اس کی تصویریں نقل دے دیتا ہوں۔ کتابیں تحفتاً بھی دیتا رہتا ہوں۔ ایک عرصے سے شادی اور خوشی کے دوسرے مواقع پر میں قرآن مجید (خصوصاً مولانا مودودی کی ''ترجمانی'' کے ساتھ) ہدیہ کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ اب وہ CDs بھی تحفے میں دیتا ہوں جن میں قرآت قرآن مجید کے ساتھ ساتھ مولانا کی تفسیر ''تفہیم'' ہے۔

میری تعلیم کا آغاز تو ہندوستان میں میرے والد مرحوم کی اُردو اور اسلامیات کی کتابوں سے ہوا تھا جو اس وقت وہاں سکولوں میں مروج تھیں۔ میری خوش قسمتی اور اعزاز تھا کہ پاکستان میں آ کر یہاں درسیات کی تدوین اور تالیف میں، میں نے ان کے ساتھ کچھ کام کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں اُن کی فکر اور فہم دین اور اسلوب زندگی سے سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ شیخ احمد سرہندیؒ سے اُنہی نے مجھے متعارف کرایا تھا اور اُن کی فکر پر کام کرنے کو آمادہ کیا تھا۔ اُن کے دوست اور میرے بزرگ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاںؒ نے مجھے حضرت مجدد کے ''مکتوبات'' کا مشہور امرتسر ایڈیشن اور ان کی کئی فارسی تحریریں دیں۔ کچھ کتابیں اس سلسلے کے ایک اور بزرگ حاجی محمد اعلیٰ نے بھی عنایت کیں۔ میرے دوست

خالد اسحٰق ایڈووکیٹ مرحوم نے مجھے اپنا نہایت قیمتی اور بہت منظم کتب خانہ استعمال کرنے کی کھلی اجازت دی تھی اور میرے لیے ایک گوشہ مخصوص کرا دیا تھا جہاں میں نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے کی نوک پلک درست کی اور اسے تکمیل کو پہنچایا۔ خالد اسحٰق صاحب میرے خیال میں پاکستان یا شاید آج کی دنیا میں (خدا بخش لائبریری) پٹنہ کے استثنا کے ساتھ، جو میں نے نہیں دیکھی، سب سے بڑی نجی لائبریری رکھتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ یہ کتب خانہ کراچی ہی میں رہے اور یہاں لوگ اس سے مستفید ہوں، مگر ان کی وفات کے بعد (اُن کے قریبی دوست سعید صاحب کی کوششوں کے علی الرغم) اُن کے بچوں کی مرضی سے کتابوں کا یہ قیمتی ذخیرہ لاہور کے ایک تعلیمی ادارے کی تحویل میں چلا گیا۔

میرے پاس کتابوں کا کوئی بڑا ذخیرہ تو نہیں۔ والد مرحوم کی وہ کتابیں ہیں جو ہندوستان سے یہاں آ سکیں۔ چند سو میری کتابیں ہوں گی۔ ان میں شبلی، سید سلیمان ندوی، مولانا مودودیؒ کی کتابیں، فلسفہ تاریخ اور متفرق موضوعات پر کتابیں اور جرائد، دائرہ معارف اسلامیہ جیسی کتابیں شامل ہیں، لیکن اب کتابوں کو سنبھالنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔

میں عاریتاً کتابیں صرف ''معتبر'' لوگوں ہی کو دیتا ہوں۔ تاہم محسوس ہوتا ہے کہ میرے علم و ایما کے بغیر بھی بعض ''شائقین'' کتابیں لے جاتے ہیں اور واپس نہیں کرتے۔ اس کا علم اُس وقت ہوتا ہے جب اُس کتاب کی ضرورت پڑتی ہے اور وہ ''غائب پائی جاتی'' ہے۔ میری لکھی ہوئی بعض کتابیں بھی اب میرے پاس نہیں۔ ایک اہم کتاب جس کا اب بدل شاید نہ مل سکے، ''تفہیم القرآن'' (مولانا مودودی) کے پہلے ایڈیشن کی وہ پہلی جلد ہے جس پر خود مولانا مودودیؒ اور پبلشر قمر الدین صاحب کے دستخط تھے۔ ایک صاحب ''درس'' کے لیے گئے اور پھر واپس نہ آئی۔

معالعہ کے لیے کوئی مخصوص اوقات نہیں۔ جب بھی موقع مل جائے اور جو موزوں کتاب دست یاب ہو، پڑھ لیتا ہوں، لیکن رات سونے سے پہلے (بعض اوقات دیر تک) پڑھنے کی عادت ہے۔ دن میں پڑھنے کی نشست عموماً میز، کرسی پر اور رات میں بھی اس طرح یا لیٹ کر مطالعہ کرتا ہوں۔

عام تعلیم یافتہ افراد کے لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ رات میں یا دن کے فرائض میں سے جو قت وہ نکال سکیں، مطالعے کی عادت ڈالیں۔ اخبارات اور ہنگامی، وقتی تحریروں اور ٹی وی پر زیادہ وقت صرف نہ کریں، اپنے محلے یا سہولت کے مقام پر کوئی کتب خانہ تلاش کریں جہاں کتابیں عاریتاً مل سکتی ہوں۔ پرانی یا اپنی کتاب کو تختۂ مشق نہ بنائیں۔ اس پر کچھ لکھنے یا نشان لگانے سے پرہیز کریں۔ میں نے بعض اچھے کتب خانوں کی قیمتی کتابوں کو دیکھا ہے کہ ان میں بعض ''قارئین'' نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے۔ اپنی قیمتی آرا درج کی ہیں اور بعض ظالموں نے ورق پھاڑ لیے یا بلیڈ سے تراش لیے ہیں۔ یہ بہت افسوس ناک ہے۔ اخبار کا بل کم کر کے کچھ رقم کتابوں پر صرف کریں۔ تفریحی ادب میں پہلے ہمارے کلاسیکی ادب کو پڑھنے کی کوشش کریں۔ ساتھ ہی سنجیدہ علمی تحریروں کے لیے بھی وقت نکالیں۔ ادب عالیہ سے غیر محسوس طور پر ہماری فکری رہ نمائی ہوتی ہے اور بالواسطہ طور پر وہ ہمارے اخلاق و عادات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ہمارے رویوں کی تراش خراش کرتا ہے اور اعلیٰ آفاق اقدار تک سہولت کے راستے لے جاتا ہے، جب کہ گھٹیا ''بازاری ادب'' فکشن، نثر اور شعر غیر محسوس طریقے سے ہمیں ''اسفل'' کے گڑھوں میں اُتارتا چلا جاتا ہے اور اگر اُس کی چاٹ پڑ جائے تو پھر اس کے اثرات عام زندگی اور رویوں میں بھی نظر آنے لگتے ہیں۔

ایک عام قاری کے لیے ایک زمانے میں انگریزی میں کلاسیکی ادب (اور دوسری کتابیں) ''پیپر بیک'' میں بہت ارزاں مل جاتی تھیں۔ پاکستان میں بھی بعض اشاعتی اداروں نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا، لیکن محسوس ہوتا ہے کہ اب ایسا نہیں ہو رہا۔ اچھی کتابوں کے ارزاں ایڈیشن دست یاب ہوں گے تو طلبہ اور عام لوگوں تک اُن کی رسائی ہوگی۔ اچھے غیر ملکی ادب اور سنجیدہ علمی کتابوں کے تراجم کو بھی فروغ دینا چاہیے۔ اس سلسلے میں جاپانی قابل تقلید ہیں۔ وہاں کتابیں نہ صرف ارزاں ہیں بلکہ قابل ذکر کتابوں کے تراجم حیرت انگیز سرعت کے ساتھ بازار میں آجاتے ہیں اور دلچسپی رکھنے والے افراد کو غیر ملکی زبانوں سے محرومی کا احساس نہیں ہوتا۔ تقسیم ہند سے پہلے مرحوم حیدرآباد دکن کی ریاست میں سرکاری سرپرستی میں جو دارالترجمہ قائم تھا، اس نے اُردو جاننے والوں کی وہ خدمت کی جس کی نظیر نہیں ملتی۔ افسوس کہ پاکستان کی قومی زبان قرار دینے کے باوجود ہم اس کا عشر عشیر بھی نہ کر سکے۔ جامعہ کراچی کے شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ میں بھی زیادہ کام نہیں ہو رہا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ شعوری (غیر شعوری) طور پر ہم اُردو کو ختم کر رہے ہیں۔ رسم الخط بدل کر انگریزی حروف میں اُردو لکھی جا رہی ہے۔ درسیات میں اعلیٰ جماعتوں کے لیے اُردو کتابیں دست یاب نہیں۔ انگلش میڈیم سکولوں کا فروغ ہے اور اُردو صرف بول چال کی زبان بنتی جا رہی ہے۔ اچھے تعلیمی اداروں اور جامعات کے بچے اور نوجوان بھی اُردو کی علمی یا شعری زبان کو سمجھنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔ (یہ لطیفہ نہیں واقعہ ہے کہ ایک مشہور اعلیٰ تعلیمی ادارے کے ذہین اور صاحب ذوق نوجوان کو میں نے ''بال جبریل'' پڑھنے کے لیے کہا تو وہ حیران تھا کہ حضرت جبریل کے ''مُوئے مبارک'' کو ایک کتاب کا عنوان کس طرح بنایا جا سکتا ہے؟)

میں کوشش کر رہا ہوں کہ سکولوں اور کالجوں کے طلبہ کے لیے آٹھویں جماعت اور آگے کے لیے کچھ ایسی کتابوں کا انتخاب کروں جو ہر جماعت میں (لازمی اور اختیاری مضامین کی کتابوں کے علاوہ) اُنہیں مہیا کی جائیں اور انہیں لازماً پڑھائی جائیں۔ اس طرح وہ نہ صرف اُردو زبان کے معیاری ادب سے آشنا ہوں گے، بلکہ اُنہیں اپنی اصل ثقافت، زبان اور تہذیب سے بھی موانست ہوگی۔ بدقسمتی سے آج بیشتر اعلیٰ تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم نوجوان اور اساتذہ بھی اُردو اور اُردو ادب سے اتنے ہی واقف ہیں جتنا انہوں نے اپنی درسی کتاب میں پڑھ لیا ہے۔ اس کے علاوہ انہیں نہیں معلوم کہ ڈپٹی نذیر احمد کون تھے اور مرزا فرحت اللہ بیگ کون۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کون تھے اور میاں آزاد اور خوجی صاحب کون ہیں۔ نانی عشو کون تھیں اور مرزا ظاہر دار بیگ کون؟ اپنے کلاسیکی ادب (اور نتیجتاً ثقافتی ورثے اور اقدار سے کٹ کر جو نئی نسل وجود میں آ رہی ہے، اس کے ناخوش گوار اثرات بظاہر تو کچھ ابھی دیکھنے میں آ رہے ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ آئندہ اس کے بڑے نقصان ہوں گے کہ اس طرح ایسی قوم وجود میں آجائے گی جس کی نہ اپنی زبان ہوگی نہ اپنی ثقافت نہ اپنا ذخیرۂ اقدار نہ خیر وشر کے لیے اپنا کوئی پیمانہ۔

قرآن کریم کے علاوہ تین کتابیں کون سی ہوں گی جو میں اپنے پاس رکھنا چاہوں گا؟ یہ بہت مشکل سوال ہے۔ ہزاروں خواہشیں (یہاں کتابیں پڑھیے) ایسی کہ ہر خواہش..... بہرحال میرا خیال ہے کہ موطا امام مالک، سیرۃ النبی شبلی اور کلیات اقبال (اُردو وفارسی) ایسی تین کتابیں ہو سکتی ہیں۔ ایک کتاب کی اور اجازت ہو جائے! Dialogues of Plato۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ افلاطون کے بعد بیشتر فلسفہ اسی پر تبصرہ وتنقید ہے۔